تدبرِ قرآن

۷۷

المرسلٰت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلّق

یہ سورہ اپنے عمود، تمہید اور طرزِ استدلال کے اعتبار سے چھٹے گروپ کی سورۂ ذاریات سے اور اپنے اسلوبِ بیان اور مزاج میں سورۂ رحمان سے مشابہ ہے۔ سورۂ ذاریات میں، بطریق قسم، ہواؤں کے عجائبِ تصرفات سے عذاب اور قیامت پر استدلال کیا گیا ہے اور عمود اس کا اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ۝[1] ہے۔ اسی طرح اس سورہ میں بھی ہواؤں کے عجائبِ تصرفات کی بطور شہادت قسم کھا کر فرمایا ہے کہ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ (بے شک، جس چیز کی تمھیں وعید سنائی جا رہی ہے وہ ایک امر شدنی ہے)۔

مزاج اور اسلوبِ کلام میں سورۂ رحمان سے اس کی مشابہت یوں ہے کہ جس طرح وہ ترجیع والی سورتوں میں سے ہے، آیت فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ اس میں بار بار آئی ہے، اسی طرح اس سورہ میں آیت وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ[2] دس بار آئی ہے۔ ترجیع والی سورتوں کے باب میں، یہ اصولی حقیقت سورۂ رحمان کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ ان میں خطاب بالعموم ان ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں سے ہے جو ایک واضح حقیقت کو محض مکابرت اور انانیت کی بنا پر، جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے کان اور آنکھیں کھولنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ متکلّم صرف اپنے دلائل بیان کر دینے ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ ہر دلیل کے بعد بطور تنبیہ ان کے جرم اور انجام سے ان کو آگاہ بھی کرتا رہے۔ مخاطب کے اس مزاج کی رعایت ملحوظ نہ رکھی جائے تو جس طرح مریض کے مزاج سے ناواقف معالج کی دوا بے اثر رہ جاتی ہے اسی طرح مخاطب کے مزاج سے ناآشنا متکلّم کا کلام بھی بے اثر ہو کے رہ جاتا ہے۔ مخاطبوں کے مزاج کا اختلاف ایک امر فطری ہے اس وجہ سے اس کا لحاظ بلاغتِ کلام کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ جو لوگ اس نکتہ سے ناآشنا ہیں وہ قرآن کی اس نوع کی ترجیعات کو تکرار پر محمول کرتے ہیں حالانکہ کلام کے

---

[1] جس عذاب کی تمھیں وعید سنائی جا رہی ہے وہ سچی ہے اور جزا و سزا ایک امر شدنی ہے۔

[2] تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی۔

ادا شناس جانتے ہیں کہ قرآن میں ہر ترجیع اپنے محل میں انگشتری پر نگینہ کا حسن رکھتی ہے۔

سابق سورۃ سے اس کے تعلق کی نوعیت یہ ہے کہ اس میں استدلال کی اصل بنیاد نفس انسانی کی شہادت پر ہے۔ فطرت کے اندر خیر و شر کے درمیان امتیاز کی جو صلاحیت ودیعت ہے اس کی اساس پر جزاء و سزا کو ثابت کر کے ایک روز جزا سے ان لوگوں کو ڈرایا گیا ہے جو اس بدیہی حقیقت کو جھٹلائیں اور ان لوگوں کو بشارت دی گئی ہے جو اپنے باطن کی گواہی قبول کریں اور اپنی زندگیاں اس کے تقاضوں کے مطابق سنواریں۔ اس سورہ میں اصل استدلال آفاق کے آثار و شواہد سے ہے۔ کسی انفسی دلیل کا حوالہ ہے تو محض اشارۃً۔ گویا نوعیت استدلال دونوں میں الگ الگ ہے، موضوع کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ مزاج میں یہ فرق بالکل واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ سابق میں بشارت کا پہلو نمایاں ہے اور اس میں انذار کا۔ اس کی سب سے بڑی شہادت اس کی ترجیع سے ملتی ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱-۷) ہواؤں کے عجائب تصرفات کی شہادت اس بات پر کہ لوگوں کو جس عذاب دنیا اور عذاب آخرت سے ڈرایا جا رہا ہے وہ کوئی اَن ہونی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب چاہا اپنی ہواؤں اور بادلوں ہی کے ذریعہ سے پچھلی قوموں کو یہ کرشمہ دکھایا ہے اور جب چاہے گا قریش کو بھی یہ کرشمہ دکھا دے گا۔ اگر وہ سلامتی چاہتے ہیں تو خدا کی رحمت اور نقمت کے جو آثار ان کے آگے پیچھے موجود ہیں ان سے سبق حاصل کریں۔ خود اپنے لیے اس کو دعوت دینے کی جسارت نہ کریں۔

(۸-۱۵) ہولِ قیامت کی اجمالی تصویر جس میں یہ دکھایا ہے کہ اس آسمان و زمین کی بڑی سے بڑی چیز بھی غیر فانی اور اٹل نہ سمجھو، نہ کوئی شے بذاتِ خود قائم ہے نہ خود مختار ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے قائم اور اسی کے اذن سے حرکت و عمل کرتی ہے۔ ایک دن آئے گا کہ اللہ تعالیٰ آسمان و زمین کے سارے نظام کو درہم برہم کر دے گا۔ اسی دن رسولوں اور ان کی قوموں کے مقدمے کی روبکاری ہے۔ یہ دن بڑا ہی اہم دن ہوگا۔ اسی دن فیصلہ ہوگا کہ رسولوں نے لوگوں کو کیا بتایا اور ان کی قوموں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس دن ان لوگوں کی تباہی ہے جنھوں نے رسولوں کی تکذیب کی۔

(۱۶-۱۹) قریش کے سامنے تاریخ ماضی کا درس سوالیہ صورت میں کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے اگلی قوموں کو ہلاک کیا اور بعد میں آنے والی قوموں میں سے بھی جنھوں نے ان کی روش بد کی تقلید

کہ ہم نے ان کو بھی انہی کے پیچھے چلتا کیا؟ اگر یہ واقعہ ہے اور اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو آخر آج کے مجرموں کے معاملے میں ہماری یہ سنتِ متواتر کیوں بدل جائے گی۔

(۲۰-۲۴) انسان کے وجود اور اس کی خلقت کے مراحل سے اللہ تعالیٰ کی قدرت، ربوبیت، اور اس کی حکمت کی طرف اشارہ جس سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ انسان کا اپنا وجود شاہد ہے کہ اس کے خالق کے لیے اس کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ ایسا ضرور ہوگا اور اس دن ان لوگوں کی خرابی ہے جو اس کی تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں۔

(۲۵-۲۸) جو جیتے ہیں اور جو مرتے ہیں وہ خدا ہی کی پیدا کی ہوئی زمین پر جیتے اور مرتے ہیں۔ اسی کے اندر خدا نے ان کی پرورش کا سامان بھی مہیا کیا ہے۔ نہ خدا کے احاطۂ قدرت سے کوئی باھر ہے نہ اس کی پرورش سے کوئی مستغنی۔ یہ صورتِ حال شہادت دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک دن سب کو ضرور جمع کرے گا۔ اس دن ان لوگوں کے لیے خرابی ہے جنھوں نے اس کی قدرت و ربوبیت کی شان نہیں پہچانی اور دنیا کی سرمستیوں میں کھوئے روزِ جزاء و سزا کو جھٹلاتے رہے۔

(۲۹-۳۴) اس عذاب کی تصویر جس سے ان مکذبین کو آخرت میں سابقہ پیش آنا ہے۔

(۳۵-۴۰) مکذبین کی بے بسی و بے کسی کی تصویر۔

(۴۱-۴۵) اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کی فائز المرامی کی تصویر۔

(۴۶-۵۰) قریش کے استکبار پر ان کو دھمکی اور ان کے ایمان سے مایوسی کا اظہار۔

سُورَةُ الْمُرْسَلٰت

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيات: ۵۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ﴿۱﴾ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ﴿۲﴾ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ﴿۳﴾ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ﴿۴﴾ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ﴿۵﴾ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ﴿۶﴾ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ﴿۷﴾ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ﴿۸﴾ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ﴿۹﴾ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ﴿۱۰﴾ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ﴿۱۱﴾ لِاَیِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ﴿۱۲﴾ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ﴿۱۳﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ﴿۱۴﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۵﴾ اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿۲۰﴾ فَجَعَلْنٰهُ فِیْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۲۱﴾ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۲﴾ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۴﴾ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ﴿۲۶﴾ وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِیَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِیْ مِنَ

اٰيات ۵۰

اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾ إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾ كَأَنَّهُ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿۳۳﴾
وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۴﴾ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَلَا
يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۷﴾ هٰذَا
يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ
فَكِيْدُوْنِ ﴿۳۹﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۰﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ
فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا
هَنِيْٓئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۴۴﴾
وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ
مُّجْرِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ
ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَبِاَيِّ
حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۰﴾

ع ۱ / ۲۱

ع ۲ / ۲۲

ترجمۂ آیات ۱ - ۵۰

شاہد ہیں ہوائیں جن کی باگ چھوڑ دی جاتی ہے پس وہ اڑاتی ہیں غبار اندھا دھند اور شاہد ہیں ہوائیں پھیلانے والی (بادلوں کو)۔ پھر وہ معاملہ کرتی ہیں جدا جدا۔ پھر ڈالتی ہیں یاد دہانی اتمام حجت کے طور پر یا آگاہ کر دینے کو۔ بے شک جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ شدنی ہے ۱ - ۷

پس جب کہ ستارے بے نشان کر دیے جائیں گے، آسمان پھٹ جائے گا، پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے اور رسولوں کے لیے وقت مقرر ہوگا —— کس دن کے لیے وہ ٹالے گئے ہیں! —— فیصلہ کے دن کے لیے! اور تم کیا سمجھے کیا ہے فیصلہ

کا دن! تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی! ۸ - ۱۵

کیا ہم نے اگلوں کو ہلاک نہیں کیا؟ پھر ان کے پیچھے پچھلوں کو نہیں لگاتے رہے ہیں؟ ہم مجرموں کے ساتھ یہی معاملہ کرتے ہیں۔ ہلاکی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے! ۱۶ - ۱۹

کیا ہم نے تم کو ایک حقیر پانی سے نہیں پیدا کیا؟ پس ہم نے اس کو رکھا ایک محفوظ مقام میں۔ ایک معین مدت تک۔ پس ہم نے اس کو ٹھہرایا اور ہم کیا ہی خوب ٹھہرانے والے ہیں! خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی! ۲۰ - ۲۴

کیا ہم نے زمین کو سمیٹ رکھنے والی نہیں بنایا زندوں اور مردوں کو؟ اور گاڑے اس میں پہاڑ اونچے اور پلایا تم کو پانی خوشگوار؟ — ہلاکی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے! ۲۵ - ۲۸

چلو اس کی طرف جس کو جھٹلاتے رہے ہو، چلو تین شاخوں والے سایہ کی طرف۔ جس میں نہ چھاؤں ہے نہ شعلوں کی لپیٹ سے بچاؤ۔ وہ آگ اونچے محلوں کی طرح شعلے پھینکتی ہوگی — زرد اونٹوں کی مانند — اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی ہے! ۲۹ - ۳۴

وہ دن منہ سے بات نکلنے کا نہ ہوگا اور نہ ان کو اجازت ہوگی کہ کوئی عذر پیش کر سکیں۔ اس دن جھٹلانے والوں کی تباہی ہے! ۳۵ - ۳۷

یہ ہے فیصلہ کا دن۔ ہم نے تم کو بھی اور اگلوں کو بھی جمع کر لیا۔ تو تمھارے پاس کوئی داؤ ہے تو وہ ہم سے کر دیکھو۔ اس دن جھٹلانے والوں کی تباہی ہے! ۳۸ - ۴۰

بے شک اللہ سے ڈرنے والے سایوں، چشموں اور اپنی چاہت کے میووں کے عیش میں ہوں گے۔ کھاؤ پیو راس آتا اپنے اعمال کے صلہ میں۔ ہم خوب کاروں کو اسی طرح صلہ دیتے ہیں۔ اس دن ہلاکی ہے جھٹلانے والوں کے لیے! ۴۱-۴۵

تم بھی کچھ دن کھا برت لو، تم تو ہو گنہگار۔ اس دن تباہی ہے جھٹلانے والوں کے لیے۔ ۴۶-۴۷

اور جب ان کو کہا جاتا ہے کہ اپنے رب کے آگے جھکو تو نہیں جھکتے۔ اس دن جھٹلانے والوں کی تباہی ہے۔ ۴۸-۴۹

اب اس کے بعد وہ بھلا کس چیز پر ایمان لائیں گے!! ۵۰

الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا (۱)

عذاب کے شدنی ہونے پر شہادت

'مُرْسَلٰتٌ' کے معنی چھوڑی ہوئی کے ہیں۔ یہ لفظ یہاں ہواؤں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اس سے ملائکہ کو بھی مراد لیا ہے لیکن بعد کی صفات، جیسا کہ واضح ہوگا، اس سے ابا کرتی ہیں۔ اس خیال کی بنیاد صرف اس غلط فہمی پر ہے کہ یہاں 'وَ' قسم کے لیے ہے اور عام خیال کے مطابق قسم کسی مقدس چیز کی ہونی چاہیے اس وجہ سے انھوں نے 'مُرْسَلٰتٌ' سے فرشتوں کو مراد لیا۔ لیکن ہم جگہ جگہ تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ قرآن میں قسمیں بیشتر شہادت یعنی دعوے پر دلیل کی نوعیت کی ہیں۔ یہ قسم بھی اسی نوع کی ہے جس طرح سورۂ ذاریات میں ہواؤں کی قسم عذاب اور جزا و سزا کے حق ہونے پر کھائی گئی ہے اسی طرح یہ قسم بھی وعدۂ عذاب و قیامت کے شدنی ہونے پر کھائی گئی ہے۔

لفظ 'عُرْفٌ' گھوڑے کی ایال کے بالوں کے لیے آتا ہے جو پیشانی پر لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس معنی کے لیے یہ ایک معروف لفظ ہے۔ امرؤالقیس کا مشہور شعر ہے:

نمش باعراف الجیاد اکفنا   اذا نحن قمنا عن شواء مضہب

(جب ہم شکار کا کچا پکا گوشت کھا کر اٹھتے تو گھوڑوں کی ایال میں اپنے ہاتھ پونچھ لیتے)

گھوڑوں کی ایال پکڑ کر ان کو روکا بھی جا سکتا ہے اور اس کو چھوڑ کر ان کو جولانی کے لیے چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔ آیت میں ہواؤں کو گھوڑوں سے اور ان کے آزاد کرنے کو ان کی ایال چھوڑ دینے سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ تعبیر نہایت بلیغ ہے۔ اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ہوائیں نہ خود کار ہیں نہ خود مختار بلکہ ان کی پیشانی خدا کی مٹھی میں ہے۔ جب وہ چاہتا ہے ان کو روک لیتا ہے اور جب چاہتا ہے چھوڑ دیتا ہے۔ فرمایا ہے: 'مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا' (هود - ۱۱ : ۵۶) (نہیں ہے کوئی جاندار مگر وہ اس کی پیشانی کے بال کو پکڑے ہوئے ہے)۔

فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا (۲)

'عَصْفٌ' کے معنی تگ ٹٹ اور اندھا دھند چلنے کے ہیں۔ فرمایا ہے: 'حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِى الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ' (یونس - ۱۰ : ۲۲) (یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ ان کو لے کر چلتی ہیں موافق ہوا کے ساتھ اور وہ اس سے خوش ہوتے ہیں دفعۃً نمودار ہو جاتی ہے بادِ تند اور ان کو گھیر لیتی ہیں موجیں ہر جانب سے)۔

یہ ان ہواؤں کا دوسرا مرحلہ بیان ہوا ہے کہ چھوڑے جانے کے بعد وہ بگٹٹ ہو کر تند و تیز چلنے لگتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو تند ہو کر بالآخر طوفان اور عذاب بن جاتی ہیں اور قوم کی قوم کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہیں۔ ان کے عجائب تصرفات کی تاریخ قرآن میں تفصیل سے بیان ہو چکی ہے اور آج بھی ان کی تباہ کاریوں کے تجربات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔

وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا (۳)

ابرِ رحمت والی ہوائیں

'نَشْرٌ' کے معنی پھیلانے، چھینٹنے، ابھارنے، اگانے کے ہیں۔ یہ لفظ ان تمام معانی میں، قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں اس سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو ابرِ رحمت لاتی ہیں۔ اس لیے کہ ان میں 'نشر' کے مختلف پہلو موجود ہیں۔ یہ بادلوں کو ابھارتی ہیں، پھر ان کو فضا میں پھیلاتی ہیں، پھر اپنے رب کی رحمت کو چھینٹتی اور نباتات اگا کر زمین کو سرسبز و شاداب بناتی ہیں۔ فرمایا ہے 'وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ' (الشوریٰ ۴۲: ۲۸) (اور وہی ہے جو نازل کرتا ہے بارش بعد اس کے کہ لوگ اس سے مایوس ہو چکے ہوتے ہیں اور پھیلاتا ہے اپنی رحمت)۔

اوپر کی قسم تو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، طوفانی ہواؤں کی ہے اور یہ قسم ابرِ رحمت والی ہواؤں کی ہے جن پر زندگی کے قیام و بقا کا انحصار ہے۔

یہاں زبان کا یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ عُصِفٰت کو الْمُرْسَلٰت پر 'فَ' کے ساتھ عطف کر کے اس کی تدریجی ترقی کو واضح کر دیا۔ اس کے برخلاف اس آیت میں حرف عطف 'وَ' آیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سابق کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک مستقل وصف ہے۔

فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا (۴)

ہوائیں خود مختار نہیں بلکہ مسخر ہیں

یہ وہی مضمون ہے جو سورۂ ذاریات میں 'فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے یعنی یہ ہوائیں فرق و امتیاز کرتی ہیں۔ کبھی بادلوں کو ہانک کر لاتی ہیں، کبھی ان کو اڑا کر لے جاتی ہیں۔ ایک علاقہ کو جل تھل کر دیتی ہیں، دوسرے کو تشنہ چھوڑ جاتی ہیں۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہ خود کار و خود مختار نہیں بلکہ ایک بالاتر قوت کے تابع فرمان ہیں۔ یہ فرق و امتیاز چونکہ 'نشر' کے ذریعہ سے اور اس کے بعد نمایاں ہوتا ہے اس وجہ سے عطف 'فَ' کے ذریعہ سے ہوا۔

فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا (۵)

ہواؤں کی یاد دہانی

یعنی بارش کے ساتھ ساتھ یہ لوگوں پر یاد دہانی بھی اتارتی ہیں۔

بارش جن باتوں کی تذکیر کرتی ہے وہ قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہیں اور ان کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔ یہاں چند نمایاں پہلو ذہن میں تازہ کر لیجیے۔

- یہ آسمان و زمین میں توافق کے پہلو سے توحید اور اللہ ہی کی شکر گزاری کی یاد دہانی کرتی ہے۔
- اس کے اندر خدا کی ربوبیت کی جو شان ہے وہ خدا کے آگے مسئولیت کی یاد دہانی کرتی ہے۔
- مردہ زمین کو زندہ کر کے یہ بعث اور حشر و نشر کی یاد دہانی کرتی ہے۔
- کسی کے لیے رحمت اور کسی کے لیے عذاب بن کر یہ خدا کے استغنائے مطلق اور اس کے عذاب و ثواب کی یاد دہانی کرتی ہے۔

عُذْرًا اَوْ نُذْرًا (۶)

یہ مقصد بیان ہوا ہے ان کرشموں کا جو ہواؤں کے تصرفات سے ہر انسان کے مشاہدے میں آتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ کرشمے اللہ تعالیٰ لوگوں پر اتمام حجت یا ان کو بیدار کرنے کے لیے دکھاتا ہے۔ 'اَوْ' یہاں تقسیم کے لیے ہے یعنی ان لوگوں پر حجت تمام ہو جاتی ہے جو غفلت کی سرمستی میں پڑے رہنا چاہتے ہیں اور ان لوگوں کو یاد دہانی حاصل ہوتی ہے جو یاد دہانی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ سورۂ اعراف میں مصلحین کے ایک گروہ کا قول نقل ہوا ہے جس سے اس 'عُذْرًا' اور 'نُذْرًا' کی وضاحت ہوتی ہے:

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ	اور جب کہ ان سے ایک گروہ نے کہا کہ
تَعِظُوْنَ قَوْمَاۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ	ان لوگوں کو نصیحت کرنے سے کیا فائدہ جن
اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا	کو اللہ تعالیٰ یا تو ہلاک کر دینے والا ہے یا
قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ	ایک سخت عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے۔
وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝	انھوں نے جواب دیا کہ تمھارے رب کے حضور
(الاعراف - ۷ : ۱۶۴)	معذرت کے لیے اور اس لیے بھی کہ شاید وہ ڈریں۔

یعنی یہ لوگ اگر ہماری نصیحت نہ مانیں گے تو ہم اپنے فرض نصیحت سے سبکدوش ہو جائیں گے، ہم پر کوئی ذمہ داری عند اللہ باقی نہیں رہے گی۔ پھر ذمہ داری ان کی ہو گی اور یہ قیامت کے دن اپنی گمراہی کے لیے کوئی عذر نہ پیش کر سکیں گے اور اگر ہماری بات مان کر اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے بن گئے تو یہی مقصود ہے۔ یہ چیز ان کے لیے بھی باعث برکت و رحمت ہو گی اور ہمارے لیے بھی۔

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ (۷)

قسموں کا مقصود

یہ مذکورہ قسموں کا مقسم علیہ ہے۔ فرمایا کہ جس بات کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ واقع ہو کے رہے گی۔ 'تُوْعَدُوْنَ' یہاں عام ہے، اس میں وعدہ اور 'وعید' دونوں شامل ہے لیکن یہ سورہ، جیسا کہ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں، انذاری ہے اس وجہ سے یہاں وعید کا پہلو غالب ہے یعنی جس عذاب اور قیامت سے تمھیں ڈرایا جا رہا ہے وہ اٹل ہے، اس سے تمھیں سابقہ پیش آ کے رہے گا۔

عذاب اور قیامت پر ہواؤں کے تصرفات کی شہادت گوناگوں پہلوؤں سے پچھلی سورتوں میں بیان

ہو چکی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو سورۂ ذاریات کی تفسیر پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے عذاب اور قیامت کے مکذبین کو ہواؤں کے تصرفات کی طرف توجہ دلا کر متنبہ فرمایا ہے کہ اپنی قوت و سطوت پر زیادہ نازنہ فرماؤ۔ اللہ عذاب لانا چاہے تو اسے کوئی بڑا اہتمام نہیں کرنا ہے۔ جس ہوا کی لائی ہوئی بارش سے جیتے ہو اسی کے پیچ ذرا سے ڈھیلے چھوڑ دے تو چشم زدن میں تمھاری ہستی کا نام و نشان ہی مٹ جائے۔ اس دنیا میں کتنی ہی قومیں گزری ہیں جن کو ہوا ہی نے خس و خاشاک کی طرح اڑا دیا۔

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۙ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۙ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ (۸-۱۰)

قیامت کی ہلچل کی تصویر

ان آیتوں میں قیامت کی ہلچل کی تصویر ہے کہ اس دن اس کائنات کی وہ چیزیں جو بہت عظیم بڑی ہی پر شوکت اور بالکل غیر فانی اور لازوال نظر آتی ہیں اور جن کو دیکھ کر تم گمان کرتے ہو کہ بھلا ان کو ان کی جگہ سے کون ہلا سکتا ہے وہ بالکل بے نشان اور بے حقیقت ہو کے رہ جائیں گی۔ ہواؤں کے لائے ہوئے طوفانوں سے بڑے بڑے شہروں، محلوں اور قلعوں کو جس طرح بے نشان ہوتے دیکھا ہے اسی طرح اس دن ایسی ہلچل برپا ہوگی کہ ستارے بے نشان ہو جائیں گے، آسمان پھٹ جائے گا اور زمین کے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔

'طمس' کے معنی کسی چیز کو مٹا دینے اور بے نشان کر دینے کے ہیں۔ فرمایا ہے: مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ (النساء ۴: ۴۷) (قبل اس کے کہ ہم چہروں کو مٹا دیں اور ان کو ان کے پیچھے پھیر دیں)۔ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ کے معنی ہوں گے، پس جب کہ ستارے بے نور اور بے نشان کر دیے جائیں گے۔ یہی بات دوسرے مقام میں 'وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ' (التکویر-۸۱: ۲) اور 'وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ' (الانفطار-۸۲: ۲) کے الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔

'وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ' یعنی یہ آسمان جس میں کہیں کسی شگاف اور دراڑ کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی، جو بالکل ٹھوس اور محکم نظر آتا ہے قیامت کے دن پھٹ جائے گا۔ قرآن کے دوسرے مقام میں فرمایا ہے: 'وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا' (اور آسمان کھول دیا جائے گا تو وہ دروازے دروازے بن کے رہ جائے گا)۔ سورۂ انفطار میں فرمایا ہے: 'اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ' (الانفطار-۸۲: ۱) (اس دن کو یاد رکھو جس دن آسمان پاش پاش ہو جائے گا)۔

'وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ'۔ 'نسف' کے معنی ریزہ ریزہ کر دینے، پیس دینے، پراگندہ کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ متعدد مقامات میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً 'وَانْظُرْ اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِیْ ظَلْتَ عَلَیْهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِی الْیَمِّ نَسْفًا' (طٰہٰ-۲۰: ۹۷) (اور اپنے اس دیوتا کو، جس پر تو معتکف رہا ہے، دیکھ، ہم اس کو جلائیں گے پھر اس کو ریزہ ریزہ کر کے سمندر میں بکھیر دیں گے)۔

خود پہاڑوں سے متعلق، منکرینِ قیامت کے سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا گیا ہے ’’وَیَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ یَنْسِفُهَا رَبِّیْ نَسْفًا ۙ فَیَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا‘‘ (طٰہٰ ۲۰: ۱۰۵) (اور وہ تم سے پہاڑوں کی بابت سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو، میرا رب ان کو ریزہ ریزہ کر دے گا اور زمین کو صفاچٹ چھوڑ دے گا)۔

بعض مقامات میں یہ بات بھی فرمائی گئی ہے کہ قیامت کے دن پہاڑ تودۂ ریگ (کثیب مہیل) اور سراب کے مانند ہو جائیں گے۔

اوپر کی دو آیتوں میں آسمان کا حشر بیان ہوا تھا، اس آیت میں زمین پر جو کچھ گزرے گی اس کی طرف اشارہ ہے۔ زمین کی چیزوں میں استحکام اور وسعت و عظمت کے اعتبار سے، سب سے زیادہ اونچا درجہ پہاڑوں ہی کا ہے۔ چنانچہ کفار قیامت کا مذاق اڑاتے تو یہ سوال بھی کرتے کہ قیامت آئے گی تو ان پہاڑوں کا کیا بنے گا، کیا ان کو بھی وہ توڑ پھوڑ دے گی! یہاں پہاڑوں کا انجام بیان کر کے گویا اس پوری زمین کا حشر بیان کر دیا کہ جب پہاڑوں پر، جن کو لوگ اٹل خیال کرتے ہیں یہ گزرے گی تو دوسری چیزوں کا جو حال ہوگا اس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے۔

وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ (۱۱)

رسولوں اور ان کی قوموں کے مقدمہ کی رودکاری

یہ اس اصل ہونی کا بیان ہے جس کی تمہید کے طور پر اوپر کی ہولناکیاں بیان ہوئی ہیں یعنی اس دن رسولوں کے لیے وقت مقرر ہوگا۔ ان کے لیے وقت مقرر کرنے سے مقصود ظاہر ہے کہ یہی ہے کہ ایک مقررہ وقت پر وہ دربارِ الٰہی میں حاضر ہو کر اپنی قوموں کی موجودگی میں یہ بتائیں کہ جس فریضۂ انذار پر وہ مامور کیے گئے تھے وہ انھوں نے انجام دیا یا نہیں؟ اگر انجام دیا تو قوموں نے ان کو کیا جواب دیا؟ قرآن کے دوسرے مقامات میں رسولوں کے اس مقصد کے لیے جمع اور بارگاہِ الٰہی میں ان کی قوموں کے رویّے سے متعلق سوال کیے جانے اور ان کے گواہی دینے کا ذکر تفصیل سے ہوا ہے۔ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۰۹ ’’یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ‘‘ کے تحت ہم اس کی تفصیل پیش کر چکے ہیں۔ یہاں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ اس دن رسولوں اور ان کی قوموں کے مقدمہ کی رودکاری ہوگی۔ اللہ تعالیٰ رسولوں کی حاضری کے لیے بھی وقت مقرر فرمائے گا اور ان کی قوموں کی حاضری کے لیے بھی سمن جاری ہوگا۔ مزید تفصیل مطلوب ہو تو سورۂ اعراف کی آیت ۶-۷ کی تفسیر پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

فیصلے کے دن کی اہمیت

’اُقِّتَتْ‘، دراصل ’وُقِّتَتْ‘ کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ عربی زبان میں الفاظ کے اندر اس طرح کا تصرف ہو جایا کرتا ہے۔ ’اَلرُّسُلُ اُقِّتَتْ‘ کے معنی ہوں گے رسولوں کے لیے وقت مقرر کیا جائے گا۔ یہ اسی طرح کا اسلوب ہے جس طرح کہتے ہیں ’ابغنی خادمًا‘ یعنی ’ابغ لی خادمًا‘۔

لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ ۝ لِیَوْمِ الْفَصْلِ (۱۲-۱۳) جب اس دن کے ذکر تک بات پہنچ گئی تو اس کی

عظمت وہیبت کے بیان کے لیے یہ سوال مخاطبوں کے سامنے رکھ دیا کہ کچھ سمجھے کہ کس عظیم دن پر ہم نے ان رسولوں کی پیشی کو ٹالا ہے! اس کے بعد خود ہی جواب دیا ہے کہ نہ جانتے ہو تو کان کھول کر سن لو کہ لِيَوْمِ الْفَصْلِ، فیصلہ کے دن پر ٹالا ہے یعنی وہ دن ہماری عدالت کا دن ہو گا۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ (۱۴)

یہ اسلوب کلام، جگہ جگہ ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ کسی چیز کی عظمت وہیبت کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ جس طرح لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ' کے سوال سے اس کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے اسی طرح اس سوال سے اس دن کے فیصلہ کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ گویا اس کی عظمت دوبارہ یاد دلادی گئی۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۱۵)

یہ اس دن کے فیصلے کے نتیجے کا بیان ہے کہ اس دن ان لوگوں کی تباہی ہے جو اس کے جھٹلانے والے بنے رہے!

زبان کا ایک اسلوب

یہ آیت، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، اس سورہ میں بار بار آئے گی اور ہر جگہ اپنے ماسبق سے گہرے ربط کے باوصف، اس کی حیثیت بالکل مستقل ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو اس شرط کا جواب قرار دیا ہے جو اوپر مذکور ہوئی ہے لیکن یہ رائے عربیت کے خلاف ہے۔ اگر یہ جواب شرط کے محل میں ہوتی تو اس پر 'ف' آتی (الّا آنکہ جواب جملۂ فعلیہ یا ظرفیہ ہو) مثلاً فرمایا ہے: فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ۙ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ (المدثر ۷۴: ۸-۹) دوسرے مقام میں ہے: يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۙ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۭ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (الطور ۵۲: ۹-۱۱) اس قاعدے کی وضاحت ہم نے اس لیے ضروری سمجھی کہ اس جملہ کو جواب شرط مان کر اس کی تاویل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس کی تاویل صحیح نہیں ہو گی۔ آگے اس کے مواقع پر اس کی وضاحت ان شاء اللہ ہو جائے گی۔ یہاں جواب شرط محذوف ہے جس طرح اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۙ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۙ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۭ يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ (الانشقاق ۸۴: ۱-۶) میں محذوف ہے۔ جواب کے محذوف ہونے ہی کی وجہ سے یہ آیت اتنے گوناگوں پہلوؤں کی جامع بن گئی ہے کہ اس سورہ کے تقریباً ہر پیرے کے بعد یہ آئی ہے اور ہر جگہ اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ۭ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۱۶-۱۹)

دعوے کی تائید میں آفاقی شواہد

یہ اسی دعوے کی تائید میں جو اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ (۷) کے الفاظ میں اوپر مذکور ہوا، تاریخ کے آفاقی شواہد کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے تمہارے اگلوں کو ہلاک کیا اور

انہی کے پیچھے ان کے بعد والوں کو بھی لگاتے رہے ہیں؟ یہ اشارہ ظاہر ہے کہ قومِ نوح، عاد اور ثمود اور ان کے بعد آنے والی ان قوموں کی طرف ہے جن کی سرگزشتیں تفصیل سے قرآن میں بیان ہوئی ہیں، مثلاً قوم لوط، مدین اور قوم فرعون وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ جب تاریخ مسلسل اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ جن قوموں نے رسولوں اور ان کے انذار کی تکذیب کی ہم نے ان کو ہلاک کر دیا تو آخر انہی کی روش پر چلنے والے آج کے مجرموں کے باب میں ہماری سنت کیوں بدل جائے گی۔

ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ: میں میرے نزدیک فعل ناقص محذوف ہے۔ اس حذف کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اگلوں کے بعد ان کی روش کی تقلید کرنے والے پچھلوں کو بھی ہم برابر ان کے پیچھے لگاتے رہے ہیں۔ سنت الٰہی کا یہ تسلسل اس بات کی دلیل ہے کہ اس متواتر سنت میں کسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہی پہلے ہوا ہے اور یہی آئندہ ہو گا اور یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اللہ کے رسول نے جس فیصلہ کے دن یعنی آخرت سے لوگوں کو ڈرایا ہے وہ بھی لازماً ظہور میں آ کے رہے گا۔

كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ: اگرچہ یہ ایک کلیہ بیان ہوا ہے کہ ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کرتے آئے ہیں اور ایسا ہی کریں گے لیکن اس میں خاص طور پر قریش کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ہم یہی معاملہ ان کے ساتھ بھی کریں گے اگر یہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے اور قیامت کے دن جو حشر تمام مجرموں کا ہو گا وہی حشر ان کا بھی ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون سب کے لیے یکساں ہے۔

اس کے بعد وہی ترجیع والی آیت ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔ لفظ 'وَیْلٌ' نے یہاں عذاب کی ان تمام قسموں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے جن سے مجرموں کو اس دن سابقہ پیش آئے گا اور جن کی تفصیل قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ ایک مختصر لفظ ہے لیکن اس کے اختصار و ابہام کے اندر جو ہولناکی مضمر ہے وہ بڑی سے بڑی تفصیل کے اندر بھی نہیں سما سکتی۔

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۙ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۙ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۙ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۲۰-۲۴)

ایک انفسی دلیل

اوپر کی دلیل آفاقی تھی۔ اسی دعوے پر انسان کی خلقت سے یہ انفسی دلیل پیش کی گئی ہے۔ انسان کی خلقت سے قرآن نے قیامت پر متعدد پہلوؤں سے دلیل قائم کی ہے۔ مثلاً

- مٹی اور پانی کی ایک بوند سے اس کی پیدائش کا حوالہ دے کر امکانِ بعث اور امکانِ حشر و نشر کو ثابت کیا ہے۔
- اس کی خلقت کے اندر خدا کی قدرت، حکمت اور صنعت گری کے جو شواہد نمایاں ہیں ان سے جزا اور سزا کے لازم ہونے پر استدلال کیا ہے۔
- انسان کی پرورش کے لیے اس نے جو اہتمام فرمایا ہے اس سے بھی جزا اور سزا کے لزوم پر دلیل

قائم کی ہے۔

- انسان کے اندر خیر و شر کے امتیاز کی جو صفت ودیعت فرمائی ہے اس سے ایک روزِ عدل کے لازمی ہونے پر دلیل پیش کی ہے۔

یہ مطالب یوں تو پورے قرآن میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر قریب ہی کی دو سورتوں —— القیٰمۃ اور الدھر —— کے مطالب پر آپ ایک نظر ڈال لیں تو ان تمام نکات کے شواہد آپ کو مل جائیں گے۔

منکرین قیامت کے شبہ کا جواب

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۙ فَجَعَلْنٰهُ فِىْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۙ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۔ یہ منکرین قیامت کے اس شبہ کا جواب ہے جو مرکھپ اور مٹ کل جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے سے متعلق وہ ظاہر کرتے۔ ان کو براہِ راست مخاطب کر کے فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے حقیر پانی کی ایک بوند سے تم کو پیدا کیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا تو جب تم خود اپنے وجود کے اندر علانیہ مشاہدہ کرتے ہو کہ تمھارے خالق نے حقیر پانی کی ایک بوند کو انسان بنا کے کھڑا کر دیا تو تمھارے مرکھپ جانے کے بعد اگر وہ تمھیں ازسرِنو پیدا کرنا چاہے تو یہ کام اس کے لیے کیوں ناممکن یا مشکل ہو جائے گا۔ پہلی بار پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا دوسری بار!

'مَّهِيْنٍ' کے معنی حقیر و ناچیز کے ہیں۔ اس صفت کے لانے سے مقصود ایک تو یہ دکھانا ہے کہ انسان کی تخلیق کسی ایسے میٹریل سے نہیں ہوئی ہے جو نادرالوجود یا کمیاب ہو کہ اس کو دوبارہ پیدا کرنا ناممکن یا دشوار ہو جائے۔ وہ ایک بے قیمت اور حقیر چیز سے پیدا ہوا ہے جس کا نہایت وافر ذخیرہ قدرت کے پاس موجود ہے۔ دوسرے اس سے خالق کی عظیم و بے نہایت قدرت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ جو خدا پانی کی ایک بوند کو انسان بنا دے سکتا ہے اس کے لیے کوئی کام مشکل نہیں ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

'فَجَعَلْنٰهُ فِىْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ'۔ یہ ان حیرت انگیز تصرفات کی طرف اشارہ ہے جو اس حقیر قطرے کو گوہر بنانے پر قدرت صرف کرتی ہے۔ فرمایا کہ ہم اس کو ایک محفوظ و مامون جائے قرار میں رکھواتے ہیں۔ 'قَرَارٌ' سکون اور جائے سکون دونوں معنوں میں آتا ہے۔ یہاں یہ جائے قرار کے معنی میں ہے اور اشارہ اس سے رحم کی طرف ہے جس کو قدرت نے خاص اسی مقصد کے لیے ایک گوشہ مامون بنایا ہے۔ لفظ 'مَّكِيْنٍ' جب جگہ کی صفت کے لیے آتا ہے تو اس سے ایسی جگہ مراد ہوتی ہے جو اندیشوں، خطرات اور مداخلتِ غیر مطلوب سے بالکل محفوظ و مامون ہو۔

'اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ' یعنی ایک معین وقت تک ہم اس کو ایک محفوظ گوشہ میں رکھواتے ہیں تاکہ جو صلاحیتیں اس کے اندر پیدا کرنی مقصود ہیں وہ اپنے لیے جگہ بنا لیں۔ پھر یہ ہماری ہی قدرت و حکمت ہے

کر اس مدتِ معیّن کے بعد اس کو اس گوشۂ مامون سے باہر لاتے ہیں۔

فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ، میرے نزدیک اس میں پہلا لفظ قدر سے ہے اور دوسرا قدرت سے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے عجائبِ قدرت کی ان نشانیوں کی طرف توجہ دلا کر فرمایا کہ دیکھ لو، انسان کی پیدائش میں ہم نے اپنے کیا کیا کرشمے دکھائے ہیں اور ہم کتنی اعلیٰ اور برتر قدرت رکھنے والے ہیں! مطلب یہ ہے کہ جب ہماری قدرت کی یہ اعلیٰ شانیں انسان کی خلقت میں ظاہر ہیں تو ہم اس کو دوبارہ پیدا کرنا چاہیں گے تو اس سے کیوں عاجز رہ جائیں گے!

اس کے بعد آیت ترجیع ہے اور اس کا موقع یہ ہے کہ دوبارہ پیدا کیے جانے پر جو شبہات وارد کیے جا رہے ہیں ان کی تردید کے لیے تو خود ان کی خلقت ہی کافی ہے۔ ایک دن وہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور وہ دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہی خرابی کا دن ہو گا۔ سورۂ صافّات میں یہ مضمون یوں بیان ہوا ہے:

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ہ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ہ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ہ (الصّٰفّٰت ۳۷: ۱۹-۲۱)	وہ تو بس ایک ہی ڈانٹ ہو گی کہ دفعۃً وہ تاکنے لگیں گے۔ کہیں گے ہائے ہماری بدبختی! یہ تو جزا کا دن آ گیا! ہاں یہ وہی فیصلہ کا دن ہے جس کو تم جھٹلاتے رہے تھے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ہ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ہ وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ہ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۲۵-۲۸)

پرورش کا اہتمام جزا اور سزا کی دلیل ہے

یہ اسی یوم الفصل پر اس اہتمام ربوبیت سے دلیل قائم فرمائی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی پرورش کے لیے اس دنیا میں کر رکھا ہے۔ یہ دلیل قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے اور ہم ہر جگہ اس کی وضاحت کرتے آ رہے ہیں۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی پرورش کے لیے جو اہتمام فرمایا ہے اور اس مقصد کے لیے اس نے زمین و آسمان کو جس طرح مسخر کر کے اس کی خدمت میں لگا رکھا ہے اس کا لازمی اور بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ غیر مسئول اور شترِ بے مہار بنا کر نہ چھوڑے رکھا جائے بلکہ ایک ایسا دن بھی آئے جس میں اس سے پرسش ہو کہ اس نے اللہ کی نعمتوں کا حق ادا کیا یا نہیں۔ پھر جس نے ادا کیا ہو وہ انعام پائے اور جس نے ان کو طغیان و فساد کا ذریعہ بنایا ہو وہ اس کفرانِ نعمت کی سزا بھگتے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ہ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ہ 'کفت' کے معنی جمع کرنے اور اکٹھا کرنے کے ہیں۔ عربی میں 'فِعَال' کا وزن اس چیز کے لیے بھی آتا ہے جس سے فعل انجام پذیر ہو اس وجہ سے 'کِفَات' کے معنی جمع کر لینے والی کے ہوں گے۔ اسی معنی کے اعتبار سے اس میں فاعل کی قوت پیدا ہو گئی

ہے اور اس کے بعد مفعول لانا جائز ہوا۔

یہ ربوبیت اور احاطہ کے دوگونہ پہلوؤں سے معاد اور روز جزا و سزا کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ ربوبیت سے استدلال زیادہ وضاحت سے آگے والی سورہ میں ہے جو اس کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ فرمایا ہے:

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا ۝ وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا ۝ وَخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجًا ۝ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا ۝ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝ وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا ۝ وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا ۝ لِنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا ۝ وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا ۝ إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ۝ (النبا — ۷۸: ۶-۱۷)

کیا ہم نے زمین کو گہوارہ نہیں بنایا، پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا، اور تم کو جوڑے جوڑے نہیں پیدا کیا، تمہاری نیند کو دافع کلفت نہیں بنایا، رات کو پردہ پوش اور دن کو وقت معاش نہیں بنایا اور تمہارے اوپر سات محکم آسمان نہیں بنائے اور ایک روشن چراغ نہیں بنایا اور بدلیوں سے دھڑا دھڑ پانی نہیں برسایا تاکہ اس سے اگائیں غلے اور نباتات اور گھنے باغ؟ بے شک یہ چیزیں شاہد ہیں کہ فیصلہ کا دن مقرر ہے۔

احاطہ کے پہلو کی طرف اشارہ کرنے کے لیے یہاں اَحْيَآءً کے ساتھ اَمْوَاتًا کا بھی ذکر فرمایا۔ یعنی یہ زمین جس طرح اپنی آغوش میں تمام زندوں کو لیے ہوئے ہے اسی طرح تمام مردوں کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ جو مرتے ہیں وہ اس کے حدود سے کہیں باہر نہیں چلے جاتے بلکہ اسی کے اندر دفن ہوتے ہیں۔ قدرت ان کو اسی زمین کی تحویل میں بطور امانت دے دیتی ہے جس کے گہوارے میں وہ پیدا ہوتے اور پلتے ہیں۔ یہ اہتمام قدرت نے اسی لیے فرمایا ہے کہ جب لوگوں کو جمع کرنے کا وقت آئے تو وہ زمین کو حکم دے کہ جو کچھ اس کی تحویل میں ہے اس کو حاضر کرے اور وہ فوراً اس حکم کی تعمیل کرے گی۔ چنانچہ فرمایا ہے: وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۝ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۝ (الانشقاق - ۸۴: ۳ - ۴) (اور جب کہ زمین تان دی جائے گی اور جو کچھ اس کے اندر ہے وہ اس کو باہر نکال کر فارغ ہو جائے گی)۔ اسی بات کی طرف اشارہ سورۂ زلزال میں وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا (۲) کے الفاظ سے فرمایا ہے۔ ان آیات سے اس حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ جو مرتا ہے وہ کہیں ناپید نہیں ہو جاتا ہے بلکہ زمین کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے گا اس کو اسی زمین سے، جس سے اس کو پیدا کیا، پھر اٹھا کھڑا کرے گا۔ چنانچہ سورۂ طٰہٰ میں فرمایا ہے: مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ (۵۵) (اسی

زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں ہم پھر تم کو لوٹا دیتے ہیں اور پھر اسی سے تم کو دوسری بار نکالیں گے)۔

ان تمام آیات پر تدبر کی نظر ڈالیے تو ایک اور واضح تر حقیقت بھی سامنے آئے گی کہ انسان اصلاً زمین ہی کے رحم سے پیدا ہوا ہے اور جب وہ مرتا اور دفن ہوتا ہے تو گویا مرتا نہیں بلکہ اسی رحم میں واپس لوٹا دیا جاتا ہے جس سے پیدا ہوا ہے تو جب اس کا پہلی بار پیدا ہونا کسی کے نزدیک کوئی تعجب انگیز بات نہیں ہے تو اس کا دوسری بار پیدا ہونا کیوں تعجب انگیز ہو جب کہ بطنِ زمین میں اس کا تخم موجود ہے۔

وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا۔ یہ اسی ربوبیت کے مضمون سے متعلق ہے جو اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا میں بیان ہوا ہے۔ قرآن کی متعدد آیات میں یہ اشارہ موجود ہے کہ انسان کی رہائش و پرورش کے لیے زمین کو گہوارہ بنانے میں پہاڑوں کے وجود کو بڑا دخل ہے۔ اوپر سورۂ نبا کی جس آیت کا ہم نے حوالہ دیا ہے اس میں بھی فرمایا ہے کہ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا (کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو گہوارا بنایا ہے اور اس گہوارے کو متوازن رکھنے کے لیے اس میں پہاڑوں کی میخیں ٹھونکی ہیں؟) دوسرے مقام میں اسی حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے کہ وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ (لقمان ۳۱: ۱۰) (اور اس نے زمین میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے کہ مبادا وہ تمھارے سمیت کسی جانب کو لڑھک جائے)۔

پہاڑوں کے ایک اور نفع کی طرف بھی اشارہ فرمایا جو ربوبیت کے پہلو سے بڑی اہمیت رکھنے والا ہے۔ وہ یہ کہ ان پہاڑوں کی بلندی ہواؤں اور بادلوں کو کنٹرول کرنے اور پانی کے قدرتی ذخائر جمع کرنے میں بڑی مؤثر ہے۔ انسان شیریں پانی کا محتاج ہے اور یہ نعمت مہیا کرنے کے لیے قدرت نے یہ اونچے پہاڑ بنائے ہیں جو اسی کے بنانے کے ہیں کوئی دوسرا ان کو بنانے پر قادر نہیں ہے۔

اس طرح کلام درجہ بدرجہ ایک یوم الفصل اور روزِ جزاء و سزا کے ثبوت تک خود پہنچ گیا۔ اس بات کی ضرو[illegible]، باقی نہیں رہی کہ الفاظ میں بھی اس کو بیان کیا جائے۔ چنانچہ اس کے ذکر کو حذف کر کے ترجیع [illegible]یت سامنے رکھ دی۔ فرمایا: وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ یعنی جو لوگ خدا کی ربوبیت اور اس کی [illegible] قدرت کے اتنے بدیہی شواہد کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کے دن سے نچنت اور اس کو جھٹلانے والے بنے ہوئے ہیں اس دن ان کی تباہی ہے۔

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۲۹)

اوپر والی آیت میں آپ نے دیکھا کہ اس فیصلہ کے دن کا مشاہدہ آفاق و انفس کے آثار و شواہد

کے اندر کرا یا گیا ہے۔ اب چند آیتوں میں اس کی تصویر سامنے رکھ دی گئی ہے تاکہ جو چیز نگاہوں سے اوجھل ہے اس کا مشاہدہ ایک حاضر و مشہود چیز کی طرح منکرین کر لیں۔ چنانچہ اسلوب کلام ایسا اختیار فرمایا ہے گویا وہ چیز سامنے موجود ہے اور ان کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اب تک جس چیز کو جھٹلاتے رہے ہیں اس کی طرف چلیں اور اس کا مزا چکھیں۔ فرمایا کہ چلو اس چیز کی طرف جس کو اب تک جھٹلاتے رہے ہو۔

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ (۳۰)

'اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ' کے الفاظ میں جو ہولناک چیز چھپی ہوئی تھی یہ اس سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے۔ فرمایا کہ ان تین شاخوں والے سایہ کی طرف چلو۔ 'ظِلٌّ' کے معنی تو سایہ کے ہیں لیکن یہاں ظاہر ہے کہ اس سے مراد معروف سایہ نہیں بلکہ دھوئیں کا سایہ ہے۔ سورۂ واقعہ آیات ۴۳-۴۴ میں فرمایا ہے، 'وَظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ ۙ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِیْمٍ' (اور سیاہ دھوئیں کا سایہ، نہ ٹھنڈا نہ نفع بخش)۔

دھوئیں کے اس سائے کی صفت 'ذی ثلث شعب' آئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھواں ان کے آگے تمام سمتوں میں پھیلا ہوا ہوگا، صرف وہی سمت اس کی آفت سے محفوظ ہوگی جس سے یہ مکذبین جیسا کہ لفظ 'اِنْطَلِقُوْٓا' سے واضح ہے، کھدیڑ دیے جائیں گے جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے بعد ان کے لیے دھواں ہی دھواں ہوگا۔

اس ٹکڑے کی تاویل میں بعض اصحاب علم نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ کفر کی بنیادی خصلتیں تین ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ سے غفلت؛ (۲) مخلوق سے بے پروائی؛ (۳) روزِ جزا کا انکار۔ انہی تین خصلتوں کے مطابق عذاب کی تین شاخیں ان کی طرف بڑھیں گی اور ان کو چھا لیں گی۔ یہ نکتہ لطیف ہے لیکن یہ تینوں خصلتیں باہم دگر بالکل لازم و ملزوم بھی ہیں اور یہ تمام کفار میں مشترک بھی نہیں۔ ان کی بنیاد پر کفار کی الگ الگ درجہ بندی کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ واضح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ سمتیں بہر حال چار ہی ہوتی ہیں تو جب وہ اس سمت سے نکال دیے جائیں گے جو اس دھوئیں کے عذاب سے محفوظ ہوگی تو تین سمتیں بچ رہتی ہیں اور یہ تینوں اس دھوئیں کے احاطہ میں ہوں گی۔ گویا اس کے بعد وہ ہر طرف سے دھوئیں کے عذاب میں ہوں گے۔

لَّا ظَلِیْلٍ وَّلَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّهَبِ (۳۱)

یہ بر سر موقع ایک مغالطہ کو رفع کیا ہے جو لفظ 'ظِلٌّ' سے پیدا ہوتا ہے۔ فرمایا کہ اس سایہ میں نہ چھاؤں ہوگی نہ شعلوں کی لپیٹ سے وہ بچاؤ کرنے والا بنے گا۔ یہی بات ذرا مختلف الفاظ میں سورۂ واقعہ کی اس آیت میں فرمائی گئی ہے جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ فرمایا ہے: 'وَظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ ۙ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِیْمٍ' (سیاہ دھوئیں جن کا سایہ نہ ٹھنڈا نہ فیض بخش) گویا دھوئیں کے اذیت بخش پہلو تو اس کے اندر سارے ہوں گے لیکن نفع بخش پہلو، جن کی توقع ہو سکتی تھی، ان کی نفی کر دی گئی۔

إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ (۳۲)

'اِنَّھَا' میں ضمیر کا مرجع وہ آگ ہے جو دھوئیں کے ذکر سے بطور اس کے لازم کے مفہوم ہوتی ہے۔ فرمایا کہ وہ گنبد کے برابر چنگاریاں اور شعلے پھینک رہی ہوگی۔ 'قصر' کی قرارت اور معنی میں بعض لوگوں نے اختلاف کیا ہے لیکن ہم نے اپنی اس کتاب میں ہر جگہ متواتر قرارت ہی کو ترجیح دی ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں یہ محل اور گنبد ہی کے معنی میں ہے اور یہ نہایت عمدہ تشبیہ ہے آگ کے کسی بڑے الاؤ سے اٹھتے شعلوں کی۔ یہ تشبیہ شعلوں کے پھیلاؤ، ان کی بلندی اور ان کے رنگ کی دی گئی ہے۔ محل بالعموم بلند جگہوں پر بنائے جاتے ہیں۔ دور سے دیکھیے تو وہ چمکتے ہوئے نظر آئیں گے اور اوپر کا رنگ نیچے کے رنگ سے مختلف ہوگا۔

كَأَنَّهُ جِمَالَتٌ صُفْرٌ (۳۳)

یہاں ضمیر کا مرجع 'شرر' ہے اور رعایت لفظ کی گئی ہے۔ 'شرر' اسم صفت ہے۔ مذکر، مؤنث واحد اور جمع سب کے لیے اس کا استعمال یکساں ہوتا ہے۔ یہاں یہ جمع کے مفہوم میں ہے اس لیے کہ اس کی تشبیہ جمالۃ صُفر سے دی گئی ہے۔ 'جمالۃ' اونٹوں کی جماعت کو کہتے ہیں۔ یہ تشبیہ شعلوں اور چنگاریوں کے رنگ اور ان کی بڑائی دونوں کو نمایاں کر رہی ہے۔ صفرۃ (زردی) کی قید اس لیے لگائی ہے کہ دھوئیں کی آڑ سے شعلوں کا منظر ملگجے زرد رنگ کے اونٹوں کے رنگ سے بالکل مشابہ ہوتا ہے۔

آگے وہی آیت ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے کہ جس دن اس ہولناک منظر سے سابقہ پیش آئے گا اس دن ان تکذیب کرنے والوں کی تباہی ہے۔

هَٰذَا يَوْمُ لَا يَنطِقُونَ ۝ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ ۝ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ (۳۵-۳۷)

مجرموں کی بے بسی کی تصویر

روز قیامت کی ہولناکی کی تصویر کے بعد یہ مجرموں کی بے بسی اور درماندگی کی تصویر ہے کہ آج تو قیامت کی تکذیب میں ہر ایک آگے بڑھ بڑھ کر طلاقت لسانی کا ثبوت دے رہا ہے لیکن اس دن سب کی زبانیں گنگ ہوں گی، کسی کے منہ سے بات نہ نکلے گی۔ آگے کی سورہ میں جو اس کی مثنیٰ ہے فرمایا ہے 'لَا يَمْلِكُونَ مِنْهُ خِطَابًا' (النبا - ۷۸ : ۳۷) (اس دن مجرمین اس سے خطاب نہ کر سکیں گے)۔

قرآن میں یہ تصریح بھی ہے کہ اس دن مجرموں کے مونہوں پر مہر کر دی جائے گی اور اللہ تعالیٰ ان کے اعضاء کو ناطق بنا دے گا جو ان کے تمام جرائم کی گواہی دیں گے۔

'وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ' یعنی نہ تو وہ خود زبان کھولنے کی جرأت کریں گے اور نہ ان کو یہ اجازت ملے گی کہ ان کے پاس کوئی عذر ہو تو اس کو پیش کریں۔

'وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ' ان کی اس بے بسی کے بیان کے بعد وہی آیت ترجیع ہے اور

اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے کہ جب حال یہ ہو کہ نہ وہ خود کوئی بات زبان سے نکالنے میں پہل کر سکیں گے اور نہ ان کو کوئی عذر پیش کرنے کی اجازت ہی ملے گی تو ہلاکی اور تباہی کے سوا ان کے لیے کیا چیز باقی رہی!

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ○ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ○ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (۳۸-۴۰)

یہ ان مجرموں کو براہِ راست خطاب کر کے ارشاد ہو گا کہ تم جس یوم الفصل کی تکذیب کرتے رہے تھے آج اس کی عدالت تمہارا فیصلہ سنانے کے لیے قائم ہو گئی۔ دیکھ لو، ہم نے تم کو بھی جمع کر لیا اور تمہارے اگلوں کو بھی۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ کفار جب قیامت کا مذاق اڑاتے تو یہ بھی کہتے کہ کیا جب قیامت آئے گی تو اس دن ہمارے آباء و اجداد بھی اٹھائے جائیں گے؟ وہ اس طرز کے سوال سے قیامت کو ناممکن سے ناممکن تر ثابت کرنا چاہتے کہ بھلا یہ بات کس طرح تصور کی جا سکتی ہے کہ ہمارے تمام اسلاف بھی ایک دن قبروں سے اٹھائے جائیں گے! ان کے اسی سوال کو سامنے رکھ کر فرمایا کہ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ہم نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ کر دکھایا، تم بھی ہمارے سامنے موجود ہو اور تمہارے اگلے بھی!

فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ۔ یعنی دنیا میں تو تم نے ہمارے رسول کو شکست دینے کے لیے بڑی بڑی چالیں چلیں۔ اگر کوئی اور چال باقی رہ گئی ہو تو وہ بھی آزما دیکھو۔ یہاں تمہارے اگلے پچھلے سب موجود ہیں۔ اگر وہ مدد کریں تو ان کی مدد بھی حاصل کر لو۔

یہاں اس امر پر نگاہ رہے کہ رسول کے انذار کی تکذیب کے لیے کفار نے جو کوششیں کیں ان کو اللہ تعالیٰ نے 'كَيْدٌ' یعنی چال سے تعبیر فرمایا۔ اس کی وجہ جیسا کہ ہم بار بار واضح کر چکے ہیں، یہ ہے کہ اس راہ میں ان کی ساری بھاگ دوڑ محض اپنی سیادت کو بچانے کے لیے تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات حق ہے لیکن اپنی نفس پرستی اور انانیت کے سبب سے اس کے قبول کرنے پر وہ تیار نہیں ہوئے بلکہ طرح طرح کے شبہات و اعتراضات ایجاد کر کے اپنے عوام کو انھوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ جو کر رہے ہیں دلیل کے ساتھ کر رہے ہیں اور ان کا مقصود اپنے آبائی دین کا تحفظ ہے۔ حالانکہ یہ محض ان کی چال تھی۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ آگے وہی آیت ترجیع ہے جو اوپر ہر بیرے کے بعد آئی ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس مطالبہ کے بعد، جو مذکور ہوا، ان کی بے بسی ان پر بالکل واضح ہو جائے گی اور وہ اس تباہی سے دوچار ہوں گے جو اس تکذیب کے نتیجہ میں ان کے سامنے آئے گی اور جو بہت بڑی تباہی ہوگی۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ○ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ (۴۱-۴۲)

متقیوں کا انعام

اس یوم الفصل میں مجرموں کا جو فیصلہ ہوگا وہ اوپر کی آیات میں بیان ہوا کہ وہ ایک ایسی آگ کی طرف بھیجے جائیں گے جس کا دھواں ان کو ہر طرف سے گھیر لے گا۔ ان کے مقابل میں ان متقیوں کا انعام اکرام بیان ہو رہا ہے کہ وہ سایوں، چشموں اور اپنی پسند کے میووں میں ہوں گے۔ اس اسلوب بیان میں جب نعمتوں کا بیان ہوتا ہے تو اس سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ یہ نعمتیں ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہوں گی۔ قرآن میں بھی یہ اسلوب جگہ جگہ استعمال ہوا ہے اور کلام عرب میں بھی اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۴۳)

یہ ان کو خوش خبری دی جائے گی کہ اب چین سے کھاؤ پیو۔ تمہارا یہ کھانا پینا راس آنے والا اور ہر غل وغش سے پاک ہوگا۔ یہ تمہارے ان اعمال کا صلہ ہے جو تم نے دنیا میں کیے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ ناشکروں نے دنیا میں جو کھایا پیا وہ ان کے لیے آخرت میں راس آنے والا نہیں بنے گا بلکہ وہ ان کے لیے تباہی کا سبب ہوگا اس لیے کہ انھوں نے اس کھانے پینے کا حق نہیں ادا کیا لیکن تمہارا یہاں کھانا پینا راس آنے والا بنے گا اس لیے کہ تم اپنے حقوق و فرائض سے سبکدوش ہو کر آئے ہو۔

'هَنِيئًا' کے معنی راس آنے اور سازگار ہونے کے ہیں۔ یہ مفعول سے حال پڑا ہوا ہے جو فعل سابق سے مفہوم ہو رہا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے: 'فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا' (النسآء - ۴: ۴) جس میں ذوالحال واضح ہے۔ ذوالحال سے حال پڑنا عربی زبان میں معروف ہے۔ مثلاً مسافر کے لیے کہتے ہیں: راشدا مهديا۔

إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (۴۴)

یہ آیت اوپر کی آیت ۱۸ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ وہاں فرمایا ہے: 'كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ' (ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں) یہاں اس کے مقابل میں فرمایا کہ ہم خوب کاروں کو اسی طرح دیا کرتے ہیں۔ لفظ 'مُحْسِنٌ' کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔

وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ (۴۵)

یہ آیت ترجیع ہے جس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔ ایک طرف تو خوب کاروں کے لیے یہ عیش جاوداں ہوگا، دوسری طرف منکرین اس عذاب میں جھونکے جائیں گے جس کی تفصیل اوپر بیان ہوئی۔ تصور کیجیے اس بُعد کا جو دونوں کے درمیان ہوگا! جب آمنے سامنے یہ دونوں انجام نمایاں ہوں گے تب اپنی بدبختی کا ان لوگوں کو صحیح اندازہ ہوگا جنھوں نے عیش دنیا پر ریجھ کر اس کے انجام کا اندازہ نہیں کیا۔

كُلُوا وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا إِنَّكُم مُّجْرِمُونَ ۝ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ (۴۶-۴۷)

قریش کے لیڈروں کو براہِ راست خطاب

یہ آخر میں قریش کے لیڈروں سے خطاب ہے۔ اوپر جو باتیں فرمائی گئی ہیں اگرچہ وہ بھی انہی کے لیے فرمائی گئی ہیں لیکن وہ اصولی رنگ میں ہیں۔ یہ ان کو براہ راست مخاطب کر کے آگاہ کیا ہے کہ اس دنیا میں جو عیش تم کو حاصل ہے اس سے اس مغالطہ میں نہ رہو کہ آخرت ہوئی تو یہی کچھ تمھیں وہاں بھی حاصل ہوگا۔ تمھارا یہ عیش چند روزہ ہے۔ آخرت کی نعمتوں سے بہرہ مند ہونے کے لیے خوب کار بننا ضروری ہے اور تم ہو بدکار۔ مجرموں کو وہی ملے گا جس کی تفصیل سنا دی گئی۔

وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ۔ یہ آیت ترجیع ہے اور اس کا موقع ومحل بالکل واضح ہے کہ نابکاروں کے لیے اس دن بڑی تباہی ہے جس کا اندازہ اس دنیا میں نہیں کیا جا سکتا۔

وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمُ ارۡکَعُوۡا لَا یَرۡکَعُوۡنَ ۝ وَیۡلٌ یَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُکَذِّبِیۡنَ (۴۸-۴۹)

ان کو تنبیہ کرنے کے بعد پھر خطاب کی جگہ غائب کا اسلوب آگیا جس میں ان کو ملامت ہے کہ یہ بدبخت لوگ اپنی موجودہ رفاہیت کو اس بات کی دلیل تو بنائے بیٹھے ہیں کہ آخرت ہوئی تو وہاں بھی ان کے لیے عیش ہی عیش ہے لیکن جب ان کو اس عیش و رفاہیت کا حق ادا کرنے کے لیے خدا کے آگے جھکنے کی دعوت دی جاتی ہے تو نہیں جھکتے بلکہ اکڑتے ہیں۔ 'رکوع' سے یہاں نماز کی تعبیر فرمائی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری کا سب سے اعلیٰ مظہر اور کبر و غرور کی سب سے بڑی قامع ہے۔

اس کے بعد آیت ترجیع ہے جس کا موقع بالکل واضح ہے کہ جو بر خود غلط اپنا فرض ادا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں لیکن حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کی آرزوئیں پوری ہونے والی نہیں ہیں۔ وہ دن آئے گا کہ یہ دیکھیں گے کہ وہاں ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے!

یہاں وہ بات بھی یاد رکھیے جو سورۂ قلم میں گزر چکی ہے کہ قیامت کے دن اس طرح کے متکبرین سجدہ کرنے کے لیے بلائے جائیں گے لیکن انھوں نے دنیا کی زندگی میں سجدہ نہیں کیا اس وجہ سے اس دن بھی وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔ یہ چیز ثابت کر دے گی کہ یہ بھی متکبرین میں سے ہیں اس وجہ سے یہ اسی سزا کے مستحق ہیں جو متکبرین کے لیے خاص ہے۔

فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ (۵۰)

منکرین کی ہٹ دھرمی پر ملامت

یہ ان منکرین کی ہٹ دھرمی پر ملامت اور ان کے ایمان سے مایوسی کا اظہار ہے کہ جب یہ اس انذار پر ایمان نہیں لا رہے ہیں جس کو قرآن اتنے واضح دلائل کے ساتھ سنا رہا ہے تو اس کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے! مطلب یہ ہے کہ نہ کوئی چیز حسنِ استدلال میں قرآن سے بڑھ کر ہو سکتی نہ حسنِ بیان اور قوتِ تاثیر و تسخیر میں، تو جب یہ ان کی عقلوں اور ان کے دلوں پر اثر انداز نہ ہو سکا تو اس سے بڑھ کر کیا چیز ہو سکتی ہے جو اثر انداز ہو سکے گی؟ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ ان کا مرض لاعلاج ہے۔ یہ دلیل اور بیان سے سمجھنے والے لوگ نہیں ہیں بلکہ اس وقت مانیں گے جب سب کچھ آنکھوں سے دیکھ

لیں گے لیکن اس وقت کا ماننا بے سود ہوگا۔

'بَعْدَہٗ' کا مطلب بعض لوگوں نے یہ لیا ہے کہ اس دن کے آجانے کے بعد یہ لوگ کس چیز پر ایمان لائیں گے۔ ان کے نزدیک مدعا یہ ہے کہ اس انذار پر ایمان لانے کا نفع ہے تو آج ہے، جب وہ دن آجائے گا تو اس دن ایمان لائے تو کیا، نہ لائے تو کیا، اس وقت تو سب ہی ایمان لائیں گے لیکن اس سے کسی کو کوئی نفع نہیں پہنچے گا۔ اگرچہ اس تاویل کا بھی احتمال ہے لیکن قرآن کے نظائر سے زیادہ واضح تائید اسی تاویل کی نکلتی ہے جو ہم نے اختیار کی ہے۔ دوسرے مقام میں فرمایا ہے: فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ (الجاثیۃ ۴۵: ۶) اور اللہ اور اس کی آیات سے بڑھ کر اور کون سی چیز ہو سکتی ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے) احتمال اگرچہ دونوں ہی تاویلوں کی صحت کا ہے اور اصل مدعا میں بھی کچھ زیادہ بُعد نہیں ہے لیکن اس تاویل میں وسعت زیادہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اوسع واحکم۔

بتوفیق ایزدی ان سطور پر سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالحمد للّٰہِ اولاً واٰخراً۔

رحمان آباد

۸۔ مارچ ۱۹۷۹ء

۸۔ ربیع الثانی ۱۳۹۹ھ